دعوتِ اِلَی اللہ

کی ضرورت واہمیت
اور اس کے
اصول ومبادی

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501

maktaba@tanzeem.org

مؤسس انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی اپنی دلی خواہش اور جدوجہد کے تقاضوں کے عین مطابق' مرحوم کے تمام قانونی وارثین ہر مسلمان کو ڈاکٹر صاحبؒ کی طبع شدہ تصنیفات/ تالیفات' آڈیوز' ویڈیوز کو طبع/ تیار کر کے شائع کرنے کی کھلی اجازت دیتے ہیں (چاہے قیمتاً ہو یا مفت تقسیم) اور اس کے لیے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کسی قسم کی رائلٹی یا ''محفوظ حقوق'' کا تقاضا بھی نہ ہے اور نہ ہوگا' البتہ تیار کردہ مواد (آڈیوز یا ویڈیوز) اور کتب کے چند نسخے ہمارے ریکارڈ کے لیے بھیج دیے جائیں تو ممنون ہوں گے۔ تاہم ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ناپسندیدہ کوشش مثلاً تبدیلی الفاظ' غلط اقتباس' سیاق وسباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی نہ ہو اور جس سے ہماری عزت وشہرت پر حرف آئے' تو ہم اس شخص کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مکمل حق محفوظ رکھتے ہیں۔

نام کتابچہ ——— دعوت الی اللہ

طبع 1 تا 13 (مارچ 1975ء تا مئی 2017ء) ——— 27,000

طبع 14 (ستمبر 2019ء) ——— 1100

ناشر ——— ناظم نشر واشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: 35869501-3

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور

قیمت ——— 25 روپے

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

دعوت اِلی اللہ

کی ضرورت و اہمیّت

اور اس کے اصول و مبادی

ایک تقریر جو یکم اکتوبر ۱۹۷۶ء کو جامعہ محمدیہ ملتان کے سالانہ اجتماع میں کی گئی

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرّجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

بزرگو اور بھائیو!

حقیقت یہ ہے کہ میرا یہ مقام ہرگز نہ تھا کہ میں ایسے عظیم الشان دینی اجتماع سے خطاب کرتا' تاہم جب آپ حضرات کا حکم ہے تو میں کچھ معروضات پیش خدمت کرتا ہوں۔ اور اب جبکہ آپ حضرات سے ہم کلام ہونے کا ایک موقع مل ہی گیا ہے تو کوشش کرتا ہوں کہ ایسی بات آپ کے گوش گزار کروں جو حقیقتاً مفید ہو اور جس سے کم از کم ان لوگوں کو ضرور فائدہ پہنچے جو ﴿اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ﴾ کی کیفیت کے ساتھ ان گزارشات کو سنیں' اس لیے کہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں امید کی جا سکتی ہے کہ ع

شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں میری بات!

میں نے اپنی گزارشات کا عنوان قرآن حکیم کی اس آیت کو بنایا ہے:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٣٣﴾﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

''اس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور یہ کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں!''

یعنی میری آج کی گزارشات کا موضوع ہے ''دعوت الی اللہ''۔ اس موضوع کا انتخاب میں نے دو وجوہات کی بنا پر کیا ہے:

(۱) اُمت کا فرضِ منصبی

ایک یہ کہ میں اور آپ جس امت کے افراد ہیں' اس کا مقصدِ وجود اور غرضِ تأسیس ہی ''دعوت الی اللہ'' ہے' اور دنیا میں ہماری عزت اور سربلندی ہی نہیں ہمارے وجود اور بقا کا انحصار بھی اسی بات پر ہے کہ ہم اپنے اس فرضِ منصبی کو کما حقہٗ ادا کریں۔ سورۃ البقرۃ کے سترہویں رکوع میں تحویلِ قبلہ کے حکم کے ساتھ ہی یہ آیت وارد ہوئی ہے کہ:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (آیت ۱۴۳)

''ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وَسَط اس لیے بنایا ہے کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول (ﷺ) تم پر گواہ ہوں۔''

تحویلِ قبلہ کا حکم دراصل علامت (symbol) تھی اس امر کی کہ اب متولیانِ مسجدِ اقصیٰ یعنی بنو اسرائیل سے ہدایت خداوندی کی امانت داری و علمبرداری کا منصب سلب کر لیا گیا اور متولیانِ مسجدِ حرام یعنی بنو اسمٰعیل اس منصب پر فائز کر دیے گئے۔ ظاہر ہے کہ اُمتِ مسلمہ کا اصل مرکز اور قلب (nucleus) ہونے کی حیثیت بنو اسمٰعیل ہی کو حاصل ہے' ان ہی کی زبان کتاب اللہ کی حامل بنی اور ان ہی کے رسوم و رواج سے قطع و برید اور حذف و اضافے کے ساتھ خدا کی آخری شریعت کا تانا بانا تیار ہوا۔ ''آخَرِیْنَ'' یعنی وہ دوسری اقوام جو بعد میں اس امت میں شامل ہوتی چلی گئیں' معنوی اعتبار سے یقیناً ''مِنْهُمْ'' یعنی ان ہی میں سے ہیں' اور یہ بھی اللہ کا بڑا ہی فضل ہے جو ان پر ہوا' لیکن یہ

شرف ''اُمّیین'' ہی کو حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ﷺ کی بعثت ان ہی میں اور ان ہی میں سے ہوئی۔(۱)

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا! ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!

اس امت کی وجہ تشکیل اور غرضِ تأسیس سورۂ آل عمران میں ان الفاظ میں بیان ہوئی کہ:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آیت ۱۱۰)

''تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے برپا کیا گیا ہے' تم حکم دیتے ہو نیکی کا' روکتے ہو بدی سے اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔''

گویا دنیا کی دوسری تمام اقوام و امم اپنے لیے جیتی ہیں اور ان کا مطمحِ نظر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ ان کا بول بالا اور عظمت دوبالا ہو اور وہ آدم کی زیادہ سے زیادہ اولاد کو' بس پڑے تو عسکری و سیاسی ورنہ کم از کم معاشی و تہذیبی تسلط کے چنگل میں گرفتار کر کے اپنے تابع رکھ سکیں۔ لیکن اس امت کا جینا اس لیے ہے کہ دنیا میں اللہ کا نام رہے'(۲) اس کا کلمہ بلند ہو' حق کا بول بالا ہو' نیکیاں عام ہوں اور اچھائیاں پروان چڑھیں' اور بدیاں ختم ہوں اور برائیوں کا استیصال ہو جائے۔ یعنی یہ اُمت دراصل دنیا میں خدا کی نمائندہ' خیر کا ذریعہ و آلہ (instrument) اور شر اور باطل کے استیصال کا ادارہ (institution) ہے۔

جب تک یہ اپنے اس فرضِ منصبی کو ادا کرتی رہی' اس کا اپنا بول بھی بالا رہا اور حق کے ساتھ یہ بھی سربلند رہی۔ لیکن جب اس نے اپنے مقصدِ وجود کو بھلا دیا اور یہ بھی بس دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ایک قوم بن کر رہ گئی تو اس پر بھی اسی طرح عتابِ خداوندی نازل ہوا جس طرح اس سے پہلے بنی اسرائیل پر ہوا تھا۔ اوّل اوّل معاملہ صرف ﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾(۳) تک محدود رہا اور عالمِ اسلام کی

(۱) اشارہ ہے سورۃ الجمعہ کی آیات ۲ تا ۴ کی جانب!

(۲) ع ''ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے!'' (اقبال)

(۳) ''اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اسی مقام پر فائز کر دے گا۔'' (محمد: ۳۸)

سیادت بنی اسمٰعیل یعنی عربوں سے چھین کر کردوں اور سلجوقیوں کو عطا کر دی گئی۔ اس پر بھی آنکھیں نہ کھلیں تو فتنۂ تاتار کی صورت میں قہرِ خداوندی کا ''وعدۂ اولیٰ'' نازل ہوا اور ﴿بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ﴾[1] کا ہو بہو نقشہ کھچ گیا۔ تاریخ حیران کہ اہلِ ہند فتنۂ تاتار کا انتظار ہی کیوں کرتے رہ گئے اور کیوں اُن کا رخ تیر کی مانند سیدھا بغداد کی طرف رہا۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس امت کا مرکز بنو اسمٰعیل تھے اور اس کا قلب بغداد تھا اور اصل گوشمالی ان کی مطلوب تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں میں سے جو قومیں اُبھریں، وہ بنی اسمٰعیل میں سے نہ تھیں، ''آخرین'' میں سے تھیں یعنی ہند میں مغل اور ایشیائے کوچک میں ترک جو بالآخر خلافت اسلامی کے بھی وارث ہوئے۔ اس طرح بنو اسمٰعیل کی مذہبی و دینی سیادت کا آخری امتیازی نشان بھی مٹ گیا۔ ان کی حیثیت ترکوں کے محکوموں اور باج گزاروں سے زیادہ کچھ نہ رہی۔ یہ تو اس صدی کے واقعات ہیں کہ اس کے اوائل میں وہ ترکوں کی غلامی سے نکل کر پہلے یورپی تسلّط کے تحت آئے اور پھر صدی کے وسط کے لگ بھگ آہستہ آہستہ اس سے بھی نجات پائی اور آزادی کا سانس لیا۔ اس کے بعد کی ربع صدی اس داستان کا المناک ترین باب ہے کہ آزاد ہو کر بھی جب انہوں نے دین سے بے رخی اختیار کی، تعیّش و تنعّم کی زندگی کو اختیار کیا اور مغربی تہذیب کے ظاہر سے متاثر ہو کر عیاشی اور فکری و عملی آوارگی کو شعار بنایا، ملتِ اسلامی کی بجائے نسلی و وطنی عصبیتوں کو ابھارا، شریعت کو پس پشت ڈالا اور مذہب کے نام لیواؤں پر مظالم ڈھائے تو بالآخر کم از کم بنی اسمٰعیل کی حد تک تو ''وَعْدُ الْآخِرَةِ'' بھی آ کر رہا اور اللہ نے اپنی ایک علی الاعلان (proclaimed) مغضوب قوم کے ہاتھوں انہیں ایسی ذلت آمیز شکست دی کہ رہے نام اللہ کا۔[2]

---

(۱) ''ہم نے تم پر اپنے سخت جنگجو بندے مسلط کر دیے تو وہ تمہاری آبادیوں میں گھس گئے۔'' (الاسراء:۵)

(۲) راقم الحروف نے جولائی ۱۹۶۷ء کے ''میثاق'' میں سیاہ حاشیے میں لکھا تھا: ''گزشتہ ماہ اسرائیل کے ہاتھوں مسلمانانِ عرب کو جو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی اور جس پر پوری دنیا کے مسلمانوں ◄

حالیہ عرب اسرائیل جنگ سے ذلیل وخوار تو پوری ملتِ اسلامی ہوئی اور یہ داغِ رسوائی لازماً سارے ہی مسلمانوں کے حصے میں آیا' لیکن اس میں ''اَلَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ'' کا مصداق بہرحال عرب ہی ہیں۔ دینی پستی اور مذہب سے بُعد یقیناً اس وقت پوری اُمت مسلمہ ہی کا حال ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے میں مصر' شام اور لبنان کی بدمستیاں دوسرے مسلمانوں سے کئی ہاتھ آگے ہیں۔ تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے اگر ذلت ورسوائی میں سے بھی سب سے بڑا حصہ انہی نے پایا۔ ویسے بھی جب عزت وفضیلت اور شرف میں مقدم تھے تو منطقی طور پر ذلت ورسوائی کا بھی حصۂ اولیٰ انہی کا ہونا چاہیے۔

قصہ طول کھینچ گیا۔ عرض صرف اس قدر کرنا تھا کہ اس امت کی غرضِ تاسیس دعوت اِلی اللہ ہے' اور اس پر نہ صرف یہ کہ اس کی عزت وعظمت کا انحصار بلکہ وجود وبقا کا دارو مدار بھی ہے اور ''اُمِّیّین'' اور ''آخَرِیْنَ'' دونوں کے لیے ایک ہی راہ ہے کہ: ﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ﴾ کی نوید جانفزا سے گرتے ہوئے حوصلوں کو از سرِ نو استوار اور ٹوٹتی ہوئی امیدوں کو نئے سرے سے قائم کریں اور ﴿وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾[1] کی وعید سے لرزاں وترساں ہو کر اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے پے در پے تنبیہات اسی لیے ہیں کہ ہم جان لیں کہ ہمارے لیے ﴿فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ﴾ کے سوا کوئی راہ نہیں ہے اور اپنی عظمت وسطوتِ پارینہ کی بازیافت ہی نہیں بلکہ اپنے وجود وبقا کی ضمانت کے لیے بھی کوئی لائحہ عمل ''دعوت الی اللہ'' کے سوا موجود نہیں ہے!

◀ نے اپنے دلوں میں درد کی شدید ٹیسیں محسوس کیں' پھر نام نہاد اقوام متحدہ نے اس معاملے میں سرد مہری ہی نہیں باقاعدہ اسرائیل نوازی کا جو رویہ اختیار کیا اس سے کم از کم مسلمانانِ عرب کے لیے تو ایک بار ﴿ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ﴾ کی وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس میں کئی ہزار سال تک بنی اسرائیل مبتلا رہے ہیں!''

اس وقت یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ صرف چار ساڑھے چار سال بعد ہی سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں عذابِ خداوندی کا ایک کوڑا ''آخرین'' کے ایک اہم حصے کی پیٹھ پر پڑنے والا ہے!

(۱) دیکھئے سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۴ تا ۸۔

(۲) رسول اللہ ﷺ کی مؤکد ترین سُنّت

دوسرا سبب آج کے اس اجتماع میں اس موضوع پر گفتگو کا یہ ہے کہ یہ ایسے لوگوں کا اجتماع ہے جو سنت رسول ﷺ کے شیدائی ہیں اور جن کا مسلک و مشرب ہی یہ ہے کہ جو آنحضور ﷺ نے کیا بس وہی کرنا چاہیے۔ مبارک ہیں آپ لوگ اگر واقعتاً آپ کے دلوں میں حضور ﷺ کی سنت کے اتباع کا جذبہ موجود ہے۔ لیکن افسوس کہ آپ کو آنحضور ﷺ کی بہت سی دوسری سنتیں تو یاد ہیں اور ان پر آپ عمل بھی پوری شدت کے ساتھ کرتے ہیں' بلکہ ان کی وجہ سے آپ دوسروں سے جنگ و جدل سے بھی نہیں چوکتے' لیکن حضور ﷺ کی سب سے بڑی سنت' جس سے زیادہ مؤکد سنت اور کوئی نہیں' جس پر آپ ﷺ کا تواترِ عمل ظاہر و باہر' جس پر آپ ﷺ اپنی بعثت کی پہلی ساعت سے حیاتِ دنیوی کی آخری گھڑی تک ہر لحظہ و ہر آن عمل پیرا رہے' اسے آپ نے نہ صرف یہ کہ عملاً ترک کر دیا ہے' بلکہ بھلا بھی دیا ہے۔ میری مراد ''سنت دعوت'' سے ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ آنحضور ﷺ کی مؤکد ترین سنت نہیں ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی بھر حضور ﷺ کو دعوت و تبلیغ سے زیادہ کسی بات کا دھیان یا دھن رہی؟ اب اگر سنت نام ہے حضور ﷺ کے طریقے اور طرزِ عمل کا' تو خدارا سوچیے کہ آنحضور ﷺ کی سب سے بڑی سنت کون سی ہے! ''بَلِّغُوْا عَنِّیْ'' کے تاکیدی حکم پر غور کیجیے کہ اس کو ''وَلَوْ آیَۃً''(۱) کے ذریعے کس قدر عمومیت دے دی گئی ہے۔ رفع یدین جس کے بارے میں آپ بہت جھگڑتے ہیں' کون ہے جو یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ اس پر آپ ﷺ عمر بھر عمل پیرا رہے! آمین بالجہر کے بارے میں کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس پر آپ ﷺ نے از اوّل تا آخر مداومت کی؟ برعکس اس کے ''دعوت و تبلیغ'' وہ سنت مؤکدہ ہے جس پر آپ ﷺ ۲۳ سال کی پوری مدت کے دوران مسلسل عمل پیرا رہے۔ گویا دعوت الی اللہ ایک طرف تو از روئے قرآن اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود اور فرضِ منصبی ہے اور دوسری طرف ہمارے محبوب پیغمبر ﷺ کی مؤکد ترین سنت ہے۔ لہٰذا اسی موضوع پر میں آپ سے چند باتیں کروں گا!

(۱) حدیث نبویؐ: ''میری جانب سے پہنچاؤ چاہے ایک ہی آیت!'' (صحیح بخاری)

دعوت الی اللہ کے مراحل و مدارج

'دعوتِ دین' یا دعوت الی اللہ کوئی مفرد یا بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد پہلو اور بے شمار مراتب و مدارج ہیں۔ یہ ایک فرد کی اپنی ذات اور اس کے اہل و عیال ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:٦) سے ہو کر اس کے کنبے قبیلے ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ (الشعراء) پھر قوم ﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ﴾ اور بالآخر پوری نوعِ انسانی ﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (البقرۃ) تک پہنچتی ہے۔ اس کی ابتدا محض خبردار کرنے اور ''ڈر سنا دینے'' ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝١ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝٢﴾ سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کا منتہائے مقصود یہ ہوتا ہے کہ خالق کائنات کی کبریائی کا اعلان و اظہار ہو ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣﴾ (المدثر)۔ حسبِ استعداد و مذاقِ مخاطبین اسے بلند پایہ علمی و عقلی استدلال کے ساتھ بھی پیش کیا جانا چاہیے: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ﴾ اور مؤثر و دلنشیں وعظ و نصیحت ﴿وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ کے ذریعے بھی۔ پھر کٹ حجتوں اور ہٹ دھرم لوگوں کے مقابلے میں بحث و جدال کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:١٢٥) اور وقت آنے پر جہاد و قتال بھی اسی دعوتِ الٰہی کی بلند ترین منازل قرار پاتے ہیں ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:٣٩) تاکہ اللہ کا کلمہ سربلند ہو، اسی کا حکم چلے اور لوگ عدل و قسط پر قائم ہوں ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید:٢٥)

آج کی اس گفتگو میں میں دعوت الی اللہ کے ان بلند مراتب سے بحث نہیں کرنا چاہتا جن کے لیے اجتماعی جدّوجہد لازمی ہے، یعنی ایک تو تمام بنی آدم پر خاتم النبیین ﷺ کی نبوت و رسالت کی جانب سے اِتمامِ حُجّت کا وہ فریضہ میری آج کی گفتگو کے دائرے سے خارج ہے جو آپ ﷺ کی اُمت پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتا ہے اور دوسرے خود اس امت کی اجتماعی اصلاح کا وہ کام بھی میری آج کی گفتگو کا براہِ راست موضوع نہیں ہے جو بجائے خود ایک منظم اجتماعی جدوجہد کا متقاضی ہے۔ اس کے برعکس آج میں ''دعوت اِلی اللہ'' کی ان ابتدائی اور بنیادی منزلوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جن تک ہر مسلمان کی رسائی ممکن بھی ہے اور لازم بھی!

سُنّتِ رسول ﷺ کا تمسخر

اس سے پہلے میں اس استہزا کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے معاشرے میں تبلیغ کے مقدس اور عظیم الشان فریضے کے ساتھ کیا جارہا ہے۔ آپ جانتے ہیں ہر مذہبی فرقے نے ''مبلغین'' کی ایک 'سول سروس' جاری کی ہوئی ہے اور اس کے تحت تنخواہ دار مبلغ بعض اختلافی مسائل پر مناظرانہ انداز کی تقریریں دیہات وقصبات میں کرتے پھرتے ہیں، جس سے اس کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ ان کے ہم مسلک وہم مشرب لوگوں پر وقتی طور پر ایک سرور کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے کہ واقعتاً ہم ہی حق پر ہیں اور ہمارا ہی مسلک صحیح تر ہے! ایسے مبلغین کی اکثریت کو تو اس کی سرے سے جرأت ہی نہیں ہوتی کہ اپنے سامعین کو براہِ راست خطاب کر کے یہ کہہ سکیں کہ تمہارے اندر یہ خرابیاں ہیں انہیں دور کرو، سودی کاروبار نہ کرو، غلط حسابات نہ رکھو، رشوت نہ لو، اسراف نہ کرو(۱)۔ بعض واعظین اگر برائے بیت ایسی کوئی بات کہہ بھی دیں تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اس لیے کہ جس اجتماع میں وہ تقریر کر رہے ہوتے ہیں اس کا اہتمام ان تمام غلط کاموں کی آمدنی سے ہوتا ہے! سامعین کی اکثریت تھوڑی دیر کے لیے اپنے مقررین کی اس حق گوئی سے بھی لذت اندوز ہولیتی ہے۔ رہے میاں حضرات اور چوہدری صاحبان تو وہ زیرلب مسکرا کر اس وقت تو ایک خاموش مگر تلخ طنز پر اکتفا کر لیتے ہیں، مگر بعد میں اپنی نجی گفتگوؤں میں اپنے مذہبی پیشواؤں کی گھریلو ونجی خامیوں اور کوتاہیوں کا اہانت آمیز تذکرہ کر کے بدلہ چکا لیتے ہیں ـــــ اور اس پورے سلسلے کا نام ہے تبلیغ دین!

حضرات! میں پورے سوز اور درد کے ساتھ یہ سوچنے کی دعوت دیتا ہوں کہ کیا یہ نبی اکرم ﷺ کی سب سے زیادہ متواتر اور مؤکد سنت کے ساتھ استہزاء اور تمسخر نہیں

---

(۱) واضح رہے کہ ازروئے قرآن علماء وصلحاءِ اُمتِ مسلمہ کا فرضِ منصبی وہ ہے جس کی جانب اس آیت کریمہ میں اشارہ ہوا کہ ﴿لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ﴾ (المائدۃ:٦٣) ''کیوں نہیں روکتے انہیں ان کے درویش اور علماء گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے؟''

ہے؟ اور کیا اس طرح نادانستہ طور پر ہم خود آنحضور ﷺ کی توہین وتحقیر کے مرتکب نہیں ہو رہے؟ منبرِ رسولؐ پر کھڑے ہونے والوں کی ہمارے اس معاشرے میں جو قدر و منزلت اور عزت و وقعت ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا اصل سبب خود وہ ہیں یا دوسرے، اس سے کیا بالواسطہ خود اس محترم ہستی ﷺ کی تحقیر نہیں ہوتی جس سے منبر منسوب ہے؟ خدا کے لیے اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی فرمائیں! تنخواہ پر کام کرنا حرام نہیں۔ لیکن واضح رہنا چاہیے کہ معاوضے پر کام کرنے والا مدرس و معلّم ہو سکتا ہے داعی و مبلغ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس راہ کی تو سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہر طرح کے مفادات و اغراض سے بالکل پاک ہو کر خالص نصح و خیر خواہی کے جذبے سے اور اس اعلان کے ساتھ کام کیا جائے کہ ﴿وَمَا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٩﴾﴾ (الشعراء) (۱)

احیائے سنت کا اجر وثواب

آپ حضرات نے حضور ﷺ کی یہ حدیث بہت مرتبہ سنی ہوگی کہ جس نے میری کسی ایسی ایک سنت کو زندہ کیا جس پر عمل متروک ہو چکا ہو تو اس کو سو شہیدوں کا اجر وثواب ملے گا۔ میں آج آپ کو اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ آپ آنحضرت ﷺ کی سنت دعوت کو زندہ کریں اور اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ میں سے ہر شخص یہ فیصلہ کرے کہ آج سے میں ''دین کا داعی'' اللہ کی طرف پکارنے والا اور حضور ﷺ کی سنتِ دعوت کا ادنیٰ متبع ہوں!

دعوت اِلی اللہ کی اصل شرط: اللہ کی ربوبیت پر اعتماد

اس بات کو بالکل دل سے نکال دیں کہ دین کی دعوت کے لیے دین کے کسی لمبے چوڑے علم کی ضرورت ہے۔ آج ''علمِ دین'' جن 'معلومات' کا نام ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ اکثر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو آپ میں سے اکثر سے کم حاصل تھیں۔ انہیں جو علم بہ تمام وکمال حاصل تھا وہ ''علم ایمان'' تھا' جیسا کہ ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''میں تم سے اس (دعوت) پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو بس اللہ کے ذمے ہے!''

تَعَلَّمْنَا الْاِیْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ(۱) ''ہم نے ایمان پہلے سیکھا' قرآن بعد میں!''

منطقی طور پر بھی ''دعوت الی اللہ'' کا اصل لازمہ ''ایمان باللہ'' ہی کو ہونا چاہیے۔ چنانچہ جو آیت میں نے سنائی تھی اس سے متصلاً قبل ایمان باللہ کی بلند ترین منزل یعنی ربوبیت خداوندی پر دل کے جم اور ٹھک جانے اور اس پر استقامت حاصل ہونے ہی کا تذکرہ ہے کہ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا.....﴾ دعوت الی اللہ کے منصب پر فائز وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو خدا کی ربوبیت پر پوری طرح مطمئن اور اس پر مضبوطی سے قائم ہوں۔

دوسری شرط: عملِ صالح

'دعوت الی اللہ' کا دوسرا لازمہ یہ ہے کہ داعی کی عملی زندگی میں ایمان باللہ کے اثرات محسوس و مشہود ہوں اور وہ عملِ صالح کا ایک حسین نمونہ ہو۔ چنانچہ اس آیت میں بھی ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰہِ﴾ کے فوراً بعد ﴿وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ کا تذکرہ ہے۔ اس لیے کہ یہ دعوت کے مؤثر ہونے کی شرط لازم ہے! اس کے بغیر' تعلیم و تدریس ہو سکتی ہے' اعلیٰ سطح کا علمی کام بھی کیا جا سکتا ہے' اور اس میں شک نہیں کہ ان چیزوں کا اپنا ایک مقام اور ان کی اپنی ایک افادیت ہے' لیکن 'دعوت' مؤثر صرف وہی ہو سکتی ہے جس کا شاہد 'عملِ صالح' ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ 'عمل صالح' ہی وہ مشکل ''گھاٹی'' ہے(۲) جس سے جی چرا کر ہم لوگوں نے یہ تقسیم کار کی ہے کہ کچھ لوگ اس کی قید سے آزاد ہوں اور حلال و حرام سب ذرائع سے دولت کما کر کچھ دوسرے لوگوں کو پالیں' جو دین کی تبلیغ کا کام کریں۔ ذہانت کا تو یہ یقیناً ایک شاہکار ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ دین کے خلاف اس ''شریفانہ معاہدے'' سے بڑی سازش شاید کوئی اور نہ ہو!

دعوت الی اللہ کا اصل ہدف

یہ آیۂ کریمہ دعوت کے مطلوبہ عمل کے ایک اور پہلو کو بھی واضح کر رہی ہے اور وہ یہ

(۱) رواہ ابن ماجہ' عن جُندب بن عبداللہ ﷺ

(۲) ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ⑪ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ⑫.....﴾ (البلد)

کہ دعوت اللہ اور اس کے دین کی طرف ہونی چاہیے نہ کہ کسی خاص فرد، یا گروہ، یا جماعت یا فرقے یا مسلک و مشرب کی طرف۔ دعوت کا اصل ہدف یہ ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اللہ کو پہچانیں، اس کی ربوبیت کا اقرار کریں اور اس پر پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ یقین رکھیں، اسی کی اطاعت و بندگی کو اپنے اوپر لازم کریں اور اسی کی رضا جوئی کو اپنی زندگیوں کا نصب العین بنائیں اور اس کے لیے حضور نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کو اختیار کریں۔ اس بات کو اس آیۂ کریمہ میں دو طرح واضح فرمایا گیا: ایک ﴿مِمَّنْ دَعٰٓى اِلَى اللّٰهِ﴾ کے الفاظ سے اشارہ کر دیا گیا کہ دعوت اللہ کی طرف ہو، کسی خاص فرد یا جماعت کی طرف نہ ہو۔ اور دوسرے ﴿وَقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝﴾ میں مزید وضاحت کر دی گئی کہ داعی خود بھی صرف مسلمان ہونے کا مدعی ہو اور کسی خاص گروہ یا فرقے کی جانب اپنے آپ کو منسوب نہ کرے، اور اس کی دعوت بھی صرف 'اسلام' کی طرف ہو نہ کہ کسی خاص مسلک و مشرب کی طرف۔ اس لیے کہ اللہ کے نزدیک تو دین بس اسلام ہی ہے: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾

تیسری شرط: تواضع اور انکساری

قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ مختصر ترین الفاظ میں وسیع ترین مفہوم کا بیان کر دیتا ہے۔ یہاں ﴿اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ میں ایک اور فتنے کی بیخ کنی بھی کر دی گئی ہے جس میں داعی کے مبتلا ہونے کا شدید خطرہ ہوتا ہے، یعنی مقامِ دعوت پر فائز ہونے کا تکبر، غرور اور گھمنڈ۔ جس سے ایک طرف داعی خود راندۂ درگاہِ حق ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اس کی دعوت کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ ان الفاظ میں ایک داعیٔ حق کے قلبی تذلل و تواضع کی کیفیت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں بھی بس ایک مسلمان ہی ہوں اور عام مسلمانوں سے کسی طرح بھی افضل یا اعلیٰ نہیں ہوں۔

دو فتنوں کا سدِ باب

اسی طرح ﴿اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ سے بیک وقت ایسے دو فتنوں کا سدِ باب کر دیا گیا جن میں عموماً اصحابِ دعوت و عزیمت کے مبتلا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، یعنی ایک

یہ کہ ان کی دعوت امت میں ایک نئے فرقے کی پیدائش کا سبب بن سکتی ہے جس سے افتراق وانتشار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا سدباب اس سے ہو جاتا ہے کہ داعی اور اس کے ساتھی یہ بات ہر وقت پیش نظر رکھیں کہ ہم بھی مسلمانوں ہی میں سے ہیں اور امت مسلمہ ہی کا ایک جزو ہیں' کوئی علیحدہ چیز نہیں! اور دوسرے یہ کہ داعی کی اپنی شخصیت ایک نیا بُت بن جائے جس کی پرستش شروع ہو جائے۔ اس فتنے کی ابتدا اصل میں داعی کی اپنی ذات سے ہوتی ہے' یعنی پہلے خود اس کے اپنے دل و دماغ میں یہ خناس پیدا ہوتا ہے کہ میں ''چیزے دگر'' ہوں۔ داعی کے قلب کا یہ احساس اس کے قریبی ساتھیوں پر منعکس ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ ''پیراں نمے پرند و مریداں مے پرانند'' کے مصداق داعی کی شخصیت لات و منات اور عُزّیٰ و ہُبل کی فہرست میں اضافے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کا سدباب صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ داعی کے سامنے ہمیشہ یہ حقیقت عیاں رہے کہ ﴿اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ میں بھی بس ایک عام مسلمان ہوں' اور اگر اللہ تعالیٰ ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾[1] کے مصداق حالت اسلام ہی میں اٹھا لے تو بس یہی میری سب سے بڑی کامیابی ہے۔

سب سے اعلیٰ کام اور سب سے عمدہ بات!

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا﴾ کے الفاظ پر بھی غور فرما لیجیے! ان الفاظ میں اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے کہ یوں تو دنیا میں ہر صاحب صلاحیت آدمی کسی نہ کسی بات کی دعوت دیتا ہی ہے' کوئی خاندان یا برادری کے مفادات کی پکار لگاتا ہے تو کوئی ملک و قوم کی عظمت کا راگ الاپتا ہے' کوئی جمہوریت کے قیام کی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے تو کوئی اشتراکیت کے نفاذ کا داعی بنتا ہے۔ لیکن ان سب سے بہت بلند' اعلیٰ اور ارفع دعوت اس کی ہے جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف پکارتا اور اس کے دین کی دعوت دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے انسان کے لیے اس مرتبے سے بلند تر کوئی مرتبہ نہیں کہ وہ ''دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ'' اور ''سِرَاجًا مُّنِیْرًا'' صلی اللہ علیہ وسلم سے کسبِ

(۱) ''اور تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر فرمانبرداری کی حالت میں۔'' (آل عمران:۱۰۲)

نور کر کے خود بھی ہدایت کا ایک چھوٹا سا چراغ بن جائے! ﴿وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿٢٦﴾﴾ (المطففین) ''پس چاہیے کہ اسی کی حرص کریں حرص کرنے والے!''

خلاصۂ کلام

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اُمتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس اور اس کا مقصدِ وجود ہی 'دعوت الی اللہ' ہے اور دنیا میں اس کی عزت و سربلندی ہی نہیں بلکہ اس کے وجود و بقا کا تمام تر انحصار بھی اس پر ہے کہ وہ اپنے اس فرضِ منصبی کو کما حقہٗ ادا کرے۔

(۲) پھر دعوت الی اللہ ہی نبی اکرم ﷺ (فداہ ابی و اُمی) کی وہ سب سے زیادہ مؤکد سنت ہے جس پر آپ کا تواتر عمل ظاہر و باہر ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ کے اتباع کا اولین تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ کی سنتِ دعوت کا اتباع کیا جائے۔

(۳) مختلف مذہبی جماعتوں اور فرقوں نے اپنے اپنے مسلک و مشرب کی اشاعت و توسیع کے لیے 'مبلغین' کی جو 'سول سروس' جاری کی ہوئی ہے وہ 'دعوت الی اللہ' کے نقطۂ نظر سے نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہے بلکہ الٹی مضر ہے!

(۴) دعوت الی اللہ کے اصل لوازم ایمان اور عملِ صالح ہیں نہ کہ فروعاتِ دین کا علم۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر یقینِ واثق اور اعمالِ صالحہ و اخلاقِ حسنہ کے امتزاجِ جمیل کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ داعی میں تواضع و انکسار پایا جائے اور اس کی دعوت بھی محض اللہ اور اس کے دین کی طرف ہو تاکہ نہ اس کی اپنی شخصیت ایک نیابت بن سکے اور نہ ہی اس کے حلقہ بگوش ایک نئے فرقے کی صورت اختیار کر سکیں۔

(۵) 'دعوت الی اللہ' کے بہت سے پہلو اور بے شمار مدارج و مراتب ہیں۔ اور آج کی گفتگو کا اصل موضوع 'دعوت الی اللہ' کی وہ ابتدائی اور بنیادی منزلیں ہیں جن تک ہر باشعور مسلمان کی رسائی ممکن بھی ہے اور لازم بھی!

اُسوۂ حسنہ

اب میں آپ کی توجہ سیرتِ محمدی ﷺ کے ان واقعات کی جانب مبذول کرانا

چاہتا ہوں جو بعثت کے فوراً بعد پیش آئے' تاکہ ایک طرف 'دعوت الی اللہ' کے اصل مبادی واصول اور اس کا صحیح نہج واسلوب واضح ہو جائے اور دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ خود آنحضور ﷺ کو دعوت کے ابتدائی دور میں وہ تمام مشکلات پیش آئیں اور ان تمام دل شکنیوں کا سامنا کرنا پڑا جو کسی بھی دعوت کے ابتدائی ایام میں پیش آنی لازمی ہیں۔ اور آپ ﷺ نے بعینہٖ انہی فطری طریقوں کو اختیار فرمایا جو کسی بھی شخص کو کسی دعوت کے پیش کرنے کے لیے لازماً اختیار کرنے پڑتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت سے پہلے کی زندگی بھی اَخلاقِ حسنہ کا ایک کامل نمونہ تھی اور آپ ﷺ کی سیرت واخلاق پر کسی قسم کا کوئی داغ یا دھبہ موجود نہ تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے حسن اخلاق اور راست معاملگی کی بدولت اپنے معاشرے سے 'الصادق' اور 'الامین' کے خطابات حاصل کیے تھے۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ آپ ﷺ نے یہ خطابات زندگی کی عین منجدھار میں رہتے ہوئے حاصل فرمائے تھے نہ کہ اس سے دور کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر۔ آپ ﷺ ہمیشہ اپنی سوسائٹی میں ایک فعال فرد کی حیثیت سے شریک رہے۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ نے اُس وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر کاروبار بھی فرمایا اور حقیقت یہ ہے کہ دراصل اسی میدان میں آپ ﷺ کی 'صداقت' اور 'امانت' کے اصل جوہر نمایاں ہوئے۔ بعد میں جب آپ ﷺ 'دعوت الی اللہ' کے منصب پر فائز ہوئے تو اس وقت آپ ﷺ کی دعوت کی تاثیر میں جہاں اس بات کو دخل ہے کہ خود وہ دعوت فطرتِ انسانی کے نہایت قریب اور عقل صحیح وطبع سلیم کی جانی پہچانی تھی وہاں اس امر کو بھی فیصلہ کن حد تک دخل حاصل ہے کہ اس کا پیش کرنے والا 'الصادق' اور 'الامین' تھا' صلی اللہ علیہ وسلم (وفداہ ابی وأمی!)

قربِ بعثت کے زمانے میں آپ ﷺ پر تفکر کا غلبہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ ''حاضر و موجود''[1] سے بیزاری اور حقیقت نفس الامری کی تلاش وجستجو کا جذبہ بڑھتا چلا گیا۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ''ثم حُبِّبَ اِلَیْہِ الْخَلَاءُ فَکَانَ یَخْلُو بِغَارِ حِرَاء

(۱) ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے (اقبال)

فَيَتَحَنَّثُ فِيْهِ'' کہ پھر آپ ﷺ کو خلوت گزینی محبوب ہوگئی۔ چنانچہ آپؐ غارِ حرا میں خلوت گزیں ہوتے تھے اور وہاں عبادت فرماتے تھے۔ شروحِ حدیث میں اس عبادت کی نوعیت التفکر والاعتبار یعنی غور وفکر اور عبرت پذیری بیان ہوئی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سلسلہ کتنے عرصے چلا۔ بہرحال وہ وقت آ گیا کہ 'تلاشِ حقیقت میں سرگرداں' کو ہدایت نامہ حاصل ہوا(۱)۔ وحی کا سلسلہ شروع ہوا' حقیقت پر سے پردے اٹھا دیے گئے۔ آپؐ کو منصب نبوت عطا ہوا اور آپؐ 'دعوت الی اللہ' کے علمبردار اور قرآن مجید کے الفاظ میں ﴿شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝۴۵ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝۴۶﴾ (الاحزاب) بنا دیے گئے! فصلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِین۔

بعثت کے فوراً بعد دعوت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چنانچہ فطری طور پر سب سے پہلے ان قریب ترین لوگوں کو دعوت دی گئی جن کے ساتھ آپ ﷺ کا اٹھنا بیٹھنا رہا تھا اور جو آپؐ کے اخلاق وعادات سے سب سے زیادہ واقف تھے' یعنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا' چچازاد بھائی جنہوں نے آپؐ ہی کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی تھی یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ' آزاد کردہ غلام حضرت زید رضی اللہ عنہ اور جگری دوست حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ۔ چنانچہ یہ سب حضرات پہلے ہی دن ایمان لے آئے اور یہیں سے 'دعوت الی اللہ' کا پہلا سبق واضح ہوا' یعنی یہ کہ یہ گھر سے شروع ہوتی ہے اور اس کا اوّلین میدان انسان کے قریب ترین اعزہ واقارب ہیں یا عزیز ترین اصدقاء واحباب!

پھر ان 'سابقون السابقین' نے اتباع سنت کا جو مفہوم سمجھا اور آنحضرت ﷺ کی سنت دعوت کا جس طور سے اتباع کیا اس کی سب سے درخشاں مثال حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قائم فرمائی کہ داعی اعظم ﷺ کے اتباع میں خود بھی فوری طور پر داعی بن گئے اور یہ ان ہی کی دعوت وتبلیغ کا اثر تھا کہ 'سابقون الاوّلون' کے سرکردہ اور گل سرسبد عثمان غنی' عبدالرحمٰن بن عوف' طلحہ' زبیر' سعد بن ابی وقاص' ابوعبیدہ بن الجراح' عثمان بن مظعون وغیرہم رضی اللہ عنہم اللہ کے دین میں داخل اور اُمت محمدی میں شامل ہوئے' فجزاہ اللّٰہ عن

---

(۱) ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷﴾ (الضحٰی) ''پایا تمہیں تلاشِ حق میں سرگرداں' تو ہدایت دی!''

جمیع المسلمین والمسلمات خیر الجزاء۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ محبتِ رسول ﷺ کا اصل تقاضا آپؐ کی سنت دعوت کا اتباع ہے۔ واضح رہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کوئی زاویہ نشین یا گوشہ گیر انسان نہ تھے بلکہ معاشرے کے ایک متمول اور بااثر شخص اور ایک نہایت کامیاب تاجر تھے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ہر شخص کے احسانات کا حساب چکا دیا سوائے ابوبکرؓ کے۔ ان کے احسانات کا بدلہ میں نہیں دے سکتا' اللہ ہی دے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی بالکل ابتدائی دور کی دعوت و تبلیغ سے اُمتِ محمدیہ ﷺ کو ان مایۂ ناز ہستیوں کا تحفہ دے کر جو احسانِ عظیم کیا ہے' پوری امت اس کا بدلہ چکانے سے تا قیامت معذور رہے گی!! یہ 'دعوت الی اللہ' کے ''شجرۂ طیبہ'' کی ایک شاخ کا ذکر تھا جو تمام شاخوں میں سب سے بڑی تھی لیکن تنہا نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی اس دعوت پر ایمان لایا وہ فوری طور پر خود بھی اس کا داعی بن گیا۔

''اصل ثابت'' کی طرف رجوع کیجیے۔ حضور ﷺ کو حکم ملا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿٢١٤﴾﴾ (الشعراء) ''اپنے قریبی عزیزوں کو خبردار کرو!'' سوچیے! آج بھی کسی کو حکم ہو کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو کوئی پیغام پہنچا دو تو وہ اس کے لیے سب سے اچھا طریقہ کون سا اختیار کرے گا؟ آنحضور ﷺ نے اپنے پورے گھرانے یعنی بنو ہاشم کی دعوت کا اہتمام فرمایا۔ چالیس کے لگ بھگ آدمیوں کو کھانا کھلانے کے بعد ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنی چاہی' لیکن ابولہب کی بکواس نے اس کا موقع ہی نہ دیا اور مجلس ویسے ہی برخاست ہو گئی۔ سوچیے کتنی دل شکنی اور کیسی مایوسی کا سامنا حضور ﷺ کو ہوا ہو گا۔ لیکن 'داعی الی اللہ' کے لیے مایوسی کا کیا سوال؟ پھر اہتمام فرمایا' دوبارہ دعوت فرمائی اور پھر کھانا کھلایا۔ روایت ہے کہ بھرے مجمعے میں سے صرف ایک نوجوان جسے نوجوان کے بجائے بھی بچہ ہی کہنا زیادہ مناسب ہے' ایسا نکلا جس نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ چشم تصور سے دیکھیے کہ اللہ کا رسول ﷺ اپنے خاندان کو اللہ کی طرف بلاتا ہے' لیکن کوئی ایک متنفس بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو پہلے ہی سے اپنے تھے' ان دونوں دعوتوں کا حاصل تو صفر ہی رہا۔ ایسے ہی تو مواقع تھے جن پر وحی الٰہی تسلی و تشفی

کے لیے اترتی تھی کہ ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾(۱) اور ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ﴾(۲)

حکم ہوا: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (الحجر:۹۴) جس بات کا آپ کو حکم ملا ہے اسے برملا اور علی الاعلان کہہ دیں! آپ ﷺ نے وقت کے رواج اور دستور کے مطابق کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا: ''واصباحاہ'' لوگو! خطرہ درپیش ہے' فوراً جمع ہو جاؤ! جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے' پہاڑی کا وعظ' ارشاد فرمایا۔ ارشاد ہوا: ''اے معشرِ قریش! اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟'' سب نے کہا ''کیوں نہیں؟ جبکہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچ بولتے ہی دیکھا ہے!'' تب آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر دردناک عذاب نازل ہو گا!'' لوگ سخت برہم ہوئے اور کہتے ہیں کہ اسی موقع پر ابولہب نے کہا تھا: تَبًّا لَكَ' أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا ''تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں' کیا بس اسی لیے تم نے ہمیں جمع کیا تھا؟'' جس پر سورۃ اللہب نازل ہوئی کہ ہاتھ محمد (ﷺ) کے نہیں بلکہ ابولہب کے ٹوٹ چکے! لیکن ابولہب کے ہاتھوں کا ٹوٹنا تو ابھی عالمِ امر میں تھا' عالمِ واقعہ میں اس کا ظہور تو بہت بعد میں ہوا۔ اُس وقت جو صورت بالفعل موجود تھی وہ تو یہی تھی کہ آنحضور ﷺ گویا اندھوں اور بہروں کے سامنے اپنی دعوت پیش فرما رہے تھے جس کا قبول کرنے والا کوئی نہ تھا۔ 'پہاڑی کے اس وعظ' کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اصل دلیل داعی کی صداقت و امانت کا وہ عام اقرار ہے جو سوسائٹی میں موجود تھا اور مقامِ نبوت کی وضاحت کے لیے موقع اور محل کے اعتبار سے بہترین تمثیل پیش کی گئی ہے کہ جیسے بلندی پر کھڑا ایک شخص دونوں طرف دیکھ رہا ہوتا ہے جبکہ پستی میں کھڑے لوگ دوسری طرف کے حالات سے واقف نہیں ہو سکتے' اسی طرح نبی کی نگاہ میں دنیا و آخرت دونوں ہوتے ہیں جبکہ عام انسانوں کی نگاہیں دنیا کے بھی صرف

---

(۱) ''اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار کرو' تم ہماری نگاہوں میں ہو!'' (الطور:۴۸)

(۲) ''اور صبر کرو اور تمہارا صبر اللہ ہی کے بھروسے پر ہے۔'' (النحل:۱۲۷)

ظاہر تک محدود ہوتی ہیں۔ ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝۷﴾ (الروم) (۱)

اس طرح رفتہ رفتہ دعوت کا حلقہ وسیع ہوا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ایسے کتنے اجتماعات کو نبی اکرم ﷺ نے خطاب فرمایا۔ کتنے لوگوں سے ان کے گھروں میں جا کر ملاقات کی اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ دُھن کا عالَم یہ تھا کہ جب بھی معلوم ہوا کہ کوئی قافلہ باہر سے آیا ہوا ہے یا کوئی نووارد مکہ میں موجود ہے۔ آپ ﷺ اس کے پاس پہنچ جاتے اور اپنی دعوت پیش فرماتے۔ اسی سے دعوت اور تعلیم و تدریس کا فرق واضح ہوتا ہے، معلّم و مدرّس یوں در در کی ٹھوکریں نہیں کھاتے بلکہ وہ مطلوب و مرجع ہوتے ہیں اور طالبانِ علم ان کے پاس آتے اور ان کی ناز برداریاں کرتے ہیں، جبکہ داعی طالب ہوتا ہے اور لوگ مطلوب۔ وہ گھر گھر جاتا ہے، ہر دروازے پر دستک دیتا ہے، ہر گوش تک اپنی آواز پہنچاتا ہے، لوگ تمسخر کرتے ہیں، تعذیب سے بھی نہیں چوکتے، جھٹلاتے اور دھتکارتے ہیں تو 'داعی الی اللہ' رات کے وقت اپنے رب کے حضور میں عاجزی و فروتنی کے ساتھ گڑگڑا گڑگڑا کر ان کی ہدایت کے لیے دعائیں کرتا ہے اور ایک ایک کا نام لے کر درخواست کرتا ہے کہ ''باری تعالیٰ! عمر بن الخطاب یا عمرو بن ہشام میں سے کوئی ایک تو مجھے ضرور ہی عطا فرما دے!'' ایک طرف یہ، اور دوسری طرف یہ بھی نگاہ میں رہے کہ ''داعی الی اللہ'' کے سینے میں پتھر کا ٹکڑا نہیں بلکہ ایک انتہائی حساس قلب ہوتا ہے جو ابنائے نوع کے کفر و انکار پر بری طرح تڑپتا ہے، ان کے انجام بد کے تصور سے اس پر غم و اندوہ کی جو حالت طاری ہوتی ہے اس سے اس پر عین عالمِ شباب میں بڑھاپے کے آثار طاری ہو جاتے ہیں اور وحی الٰہی کو بار بار تسلی و تشفی ہی نہیں محبت آمیز تنبیہ بھی کرنا پڑتی ہے کہ: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۳﴾ (الشعراء) ''(اے نبی ﷺ!) شاید تم اپنے آپ کو اس صدمے میں ہلاک کر دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے!'' اور: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝۶﴾ (الکہف)

---

(۱) ''یہ لوگ واقف ہیں حیاتِ دنیوی کے بھی بس ظاہر سے ہی، اور آخرت سے تو پورے غافل ہیں ہی!''

''(اے رسول ﷺ) شاید تم اپنے آپ کو غم سے ہلاک کر لو گے ان کے پیچھے اگر وہ اس قرآن پر ایمان نہ لائے!'' اور ﴿طٰهٰ ① مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى ②﴾ (طٰہٰ)

''ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے تو نہیں اتارا کہ تم ایسی سخت مشقت میں پڑ جاؤ۔''

دعوت کے اساسی نکات

بات طویل ہو جائے گی۔ دعوت کے اس ابتدائی مرحلے کے بعد تعذیب و ابتلاء کا جو دور شروع ہوا اور جن صبر آزما اور جاں گسل حالات سے آنحضور ﷺ اور آپؐ کے رفقائے کرام کو گزرنا پڑا وہ اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' میں اپنی آج کی گفتگو کو 'دعوت الی اللہ' کی صرف ابتدائی منزلوں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ البتہ اس گفتگو کو ختم کرنے سے قبل میں آنحضور ﷺ کا ایک خطبہ آپ کو ضرور سنانا چاہتا ہوں جو یقیناً اسی ابتدائی دور کا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوگا کہ 'دعوت الی اللہ' کے اساسی و بنیادی نکات کیا ہیں اور اس میں اوّل اوّل کن امور پر زور دیا جاتا ہے! خطباتِ نبویؐ کی کتابوں میں یہ خطبہ ان الفاظ میں نقل ہوا ہے:

((اِنَّ الرَّائِدَ لَا يَكْذِبُ اَهْلَهٗ، وَاللّٰهِ لَوْ كَذَبْتُ النَّاسَ جَمِيْعًا مَّا كَذَبْتُكُمْ، وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِيْعًا مَا غَرَرْتُكُمْ

''لوگو! تم جانتے ہو کہ رائد (راہ نما) اپنے قافلے والوں کو کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ اللہ کی قسم! اگر (بفرضِ محال) میں تمام انسانوں سے جھوٹ کہہ سکتا تب بھی تم سے کبھی نہ کہتا اور اگر تمام انسانوں کو فریب دے سکتا تب بھی تمہیں کبھی نہ دیتا۔''

وَاللّٰهِ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، اِنِّىْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَّاِلَى النَّاسِ كَافَّةً

''اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں! میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف خصوصاً اور پوری نوعِ انسانی کی طرف عموماً!''

وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ، ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءًا، وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا))

''اللہ کی قسم! تم سب مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو! پھر یقیناً اٹھائے

جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا' اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا۔ اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی۔''

اپنے اس خطبے میں آنحضور ﷺ نے نبی کے لیے انتہائی بلیغ مثال 'رائد' کی دی ہے۔ رائد کسی قافلے کا وہ معتمد ترین فرد ہوتا تھا جو سفر کی اگلی منزل کا تعین کرتا تھا اور قافلے سے آگے جا کر معلوم کرتا تھا کہ کس جگہ پڑاؤ مناسب رہے گا کہ پانی اور چارے کی سہولتیں فراہم ہوں۔ ظاہر ہے کہ 'رائد' کے صدق و امانت پر ہی پورے قافلے کی سلامتی کا دارومدار تھا اور اس کی ذرا سی غلط بیانی پورے قافلے کی ہلاکت کا سبب بن سکتی تھی۔ یہی حال 'نبی' کا ہوتا ہے کہ وہ قافلۂ دنیا کو منزل آخرت کی خبر دیتا ہے اور یہاں کی مدہوشی و غفلت پر وہاں کے دردناک انجام سے خبردار کرتا ہے۔ اس انتہائی بلیغ پیرائے میں اپنے مقام و منصب کو واضح فرما کر حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اپنی رسالت کی خبر دیتے ہیں اور پھر پورا زور اس بات پر صرف کر دیتے ہیں کہ غافلو! ہوشیار ہو جاؤ' نیند کے ماتو' جاگو' جیسے روزانہ شام ہوتی ہے ایسے ہی تمہاری پوری زندگی کے دن پر بھی ایک شام آئے گی' اور جس طرح تم پر روز نیند طاری ہو جاتی ہے اسی طرح اس شام کو موت تمہیں اپنی آغوش میں لے لے گی۔ پھر جس طرح تم روزانہ صبح بیدار ہو جاتے ہو اسی طرح ایک دن تمہیں موت کی نیند سے اٹھا لیا جائے گا۔ ﴿فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝﴾ (المدثر) (۱) پھر تمہارے زندگی بھر کے اعمال کا حساب ہوگا اور پھر بدلہ مل کر رہے گا' بھلائی کا بھلائی سے' یعنی ہمیشہ کے لیے جنت' اور برائی کا برائی سے' یعنی ہمیشہ کی آگ۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعوت الی اللہ کے بنیادی اور اساسی نکات تو تین ہی ہیں' یعنی توحید' رسالت اور معاد' لیکن ان میں بھی ابتداءً اصل زور آخرت کے محاسبے اور جزا و سزا سے خبردار کرنے پر ہونا چاہیے۔ پورا قرآن مجید اور خصوصاً ابتدائی مکیات اس پر شاہد عادل ہیں۔ اور دعوت کا جو پہلا حکم آنحضور ﷺ کو دیا گیا وہ تو اس پر آخری دلیل اور قطعی

---

(۱) ''پھر وہ دن بڑا ہی سخت دن ہے۔ منکروں پر ہرگز آسان نہیں!''

حجت ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝١ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝٢﴾ (المدثر) ''اے کپڑے میں لپٹ کر لیٹنے والے! کھڑا ہو اور خبردار کر!'' اور ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝٢١٤﴾ (الشعراء) ''اور ڈرا اپنے قریبی رشتہ داروں کو''۔ دنیا میں نظامِ دین و شریعت کا نفاذ و قیام 'دعوت الی اللہ' کا ہدف تو یقیناً ہے لیکن اسے ہدفِ بعید کہنا چاہیے۔ اس کا اوّلین ہدف ابنائے نوع کی اخروی فلاح و نجات ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے جیسے آگ کا ایک بڑا الاؤ ہے اور تم اس میں گر پڑنے کو تیار ہو اور میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر اس میں گرنے سے روک رہا ہوں۔ پھر ظاہر ہے کہ جس سے جتنی زیادہ محبت ہو اتنا ہی وہ اس دعوت میں مقدم ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ خاص اپنے گھرانے کے افراد کو لے کر بیٹھتے تھے اور فرماتے تھے:

((..... يَا عَبَّاسُ بْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبِ لَا اُغْنِيْ عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، وَيَاصَفِيَّةُ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَا اُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، وَيَافَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَلِيْنِيْ مَا شِئْتِ مِنْ مَالِيْ لَا اُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا)) (متفق علیہ)

''..... اے (میرے چچا) عباس بن عبدالمطلب' میں اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں آپ کے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اور اے اللہ کے رسول کی پھوپھی صفیہ! میں اللہ کے مقابلے میں آپ کے کچھ کام نہ آسکوں گا اور اے محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ! میرے مال میں سے جو چاہو مجھ سے مانگ لو (لیکن) میں اللہ کے مقابلے میں تمہارے کام نہ آسکوں گا۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

((يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ ﷺ اَنْقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ فَاِنِّيْ لَا اَمْلِكُ لَكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا))

''اے فاطمہ' محمد ﷺ کی بیٹی' خود اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو' اس لیے کہ اللہ کے یہاں مجھے تمہارے بارے میں کوئی اختیار نہ ہوگا!''

حضرات! یہ ہیں 'دعوت الی اللہ' کے اصول و مبادی اور یہ ہے اس کا اسلوب و نہج۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو آج کی اس مجلس سے یہ فیصلہ کر کے اٹھیں کہ ہم ان اصولوں اور

اس اسلوب پر 'دعوت الی اللہ' کا کام کریں گے اور حضور نبی کریم ﷺ کی 'سنتِ دعوت' کا اتباع کریں گے۔ میں نے اپنی اس گفتگو کو دعوت کے ابتدائی مراحل تک اس لیے محدود رکھا ہے کہ مجھے یقین ہے اور میں علیٰ وجہ البصیرت جانتا ہوں کہ اگر اس اسلوب پر 'دعوت اِلی اللہ' کے چھوٹے چھوٹے چراغ اور ننھے ننھے دیے ہمارے شہروں' بستیوں اور قصبوں میں روشن ہو گئے تو پھر اس دعوت کے اعلیٰ مقامات اور بلند تر منازل کا سامان بھی فراہم ہو جائے گا۔ اور نہ صرف یہ کہ ایک ایسی اجتماعی قوت بہم پہنچ جائے گی جو امتِ محمدی ﷺ کے جملہ اخلاقی و روحانی عوارض کا مداوا کرے اور ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾(آل عمران)[1] کی مصداق بن جائے' بلکہ وہ دن بھی دور نہ رہے گا جب یہ امت بحیثیتِ مجموعی 'دعوت الی اللہ'' کے فریضے کو ادا کرے گی اور ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ﴾(آل عمران: ۱۱۰) کی صحیح معنیٰ میں مصداق ہو گی اور تمام نوع انسانی پر نبی اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت کی جانب سے اتمامِ حجت کرے گی: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ﴾ (الحج: ۷۸)[2]۔ اس کے برعکس اگر ترتیب یہ رہے کہ بلند بانگ دعاوی سے کام شروع کیا جائے اور پہلے ہی قدم پر 'عالمی انقلاب' کا نعرہ لگایا جائے اور نجاتِ اخروی کا بس تبرکاً تذکرہ کر کے قیامِ حکومت الٰہیہ اور نفاذِ نظامِ اسلامی کو اوّلین ہدف بنا کر جدوجہد شروع کی جائے تو بسا اوقات چند ہی قدم چل کر انسان ہار جاتا ہے اور خود اپنی طے کردہ راہ کی کسی ادنیٰ سی چیز کو اپنا ''عبوری نصب العین'' قرار دے کر بس اُسی کا ہو رہتا ہے۔

فنعوذ باللہ من ذٰلك! —— اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات. وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ۝۝

---

(۱) ''اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم دے اچھے کاموں کا اور منع کرے برائی سے۔ اور وہی پہنچے اپنی مراد کو۔''

(۲) ''تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔''

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

SBU701N